حقیقت تبرا
مؤلف
علامہ فروغ کاظمی

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں۔

منجانب۔

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدرآباد پاکستان

حقیقتِ تبرّا

فروغ کاظمی

نام کتاب .... حقیقت تبرّا

مولف .... فروغ کاظمی

تعداد اشاعت .... ایک ہزار

ناشر .... ادارۂ تہذیب وادب
میدان ایلچ خاں، لکھنؤ

ہدیہ .... روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ عباس بک ایجنسی درگاہ حضرت عباس۔ رستم نگر، لکھنؤ

۲۔ شیعہ مشن۔ معصوم منزل۔ رستم نگر۔ لکھنؤ

انتساب

ایک سورۂ فاتحہ کی استدعا کے ساتھ

مجاہدِ اکبر جناب سید قیصر حسین صاحب رضوی ایڈوکیٹ مرحوم

کے نام

جن کا قومی کردار ۱۹۳۹ء کے تبرّا ایجی ٹیشن میں آفتاب کی طرح درخشاں ہے

اور

اُن کے فرزند جناب سید مہدی حسن صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا شیعہ حسینی فنڈ کے نام جنھوں نے مرحوم کی قومی خدمات کو برقرار رکھا ہے

فروغ کاظمی

انڈکس

صفحہ نمبر	مضامین

حرفِ آغاز

مولانا سید زاہد احمد صاحب قبلہ مجتہد

"تولّا اور تبرّا" یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جن کا تعلق براہ راست فطرتِ انسانی سے ہے اس لیے کہ کوئی انسان جب کسی محبوب شخصیت سے والہانہ محبت رکھتا ہے تو وہ اس کے دشمنوں اور مخالفوں سے نفرت بھی کرتا ہے۔

اسی ناقابل تردید سچائی اور فطری اصول کی بنیاد پر محقق بصیر جناب فروغ کاظمی نے اپنی اس مختصر سی کتاب میں قرآن، حدیث اور تاریخی حوالوں کے ذریعہ تبرّا کی حقیقت کو اجاگر کرنے کی ایک منطقی، کامیاب اور مستحسن کوشش کی ہے۔ اندازِ بیان ضرور کہیں کہیں پر مناظرانہ ہے اور ہونا بھی چاہیئے کیونکہ اسلام نے ہر مذہب کے لوگوں کو اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی مناظرہ کے آداب بھی سکھائے ہیں یعنی تہذیب، شائستگی اور موعظۂ حسنہ کے دائرے میں رہ کر مناظرہ کیا جا سکتا ہے، اور اگر مناظرہ میں ان احکام کو پیش نظر نہیں رکھا گیا تو اسلام مناظرہ کی اجازت نہیں دیتا میرے خیال میں اس مسئلے کی وضاحت بھی ضروری ہے تاکہ آدابِ مناظرہ سے متعلق اسلامی احکامات کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

اس سلسلے میں پہلی چیز جو غور و فکر کی محتاج ہے وہ حقیقت کا اظہار ہے مثلاً کوئی شخص

کسی شخص کو بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے چور کہہ دے تو اس کو بہتان، تہمت اور دل آزاری سے تعبیر کیا جائے گا اور اگر وہی شخص عدالت کا فیصلہ اور جیلر کا سرٹیفکیٹ پیش کر کے یہ کہہ دے کہ فلاں شخص نے فلاں کا مال چرایا تھا، عدالت نے اس جرم میں اس کو چھ ماہ کی سزا دی تھی جس کی تائید عدالت کے اس فیصلہ سے ہوتی ہے اور جیل میں چھ ماہ تک سزا کاٹنے کی تائید جیلر کے اس سرٹیفکیٹ سے ہوتی ہے تو یہ اتہام و الزام یا دل آزاری ہرگز نہیں ہے کیونکہ ہر انصاف پسند انسان دستاویزی شہادتوں کو دیکھ کر یہی کہے گا کہ چور کو چور کہنے والا حق پر ہے اور حقیقت کے اظہار کو دل آزاری کہنا درست نہیں ہے۔

اس طرح مناظرے کا ایک بنیادی اصول یہ طے پایا کہ حقیقت کا اظہار دل آزاری نہیں ہے اور اگر اس اصول کو تسلیم نہیں کیا گیا تو اسلام کا کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" دل آزاری کی تعریف میں داخل ہو جائے گا۔ اسلیے کہ بعثتِ رسولؐ سے پہلے کفارِ عرب ہزاروں خداؤں کو مانتے تھے، ہر قبیلہ کا ایک بُت ہوتا تھا جس کو اس قبیلہ کے لوگ اپنا خدا تسلیم کرتے تھے تمام خداؤں کی نفی کر کے صرف ایک خدا کے وجود کو صحیح کہنا، ہزاروں خداؤں کے ماننے والوں کے لیے دل آزاری نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ بہر حال حقیقت کے اظہار کا نام تعصب ہے اور نہ دل آزاری۔ اختلافِ عقائد کی بنیاد پر کسی حقیقت سے انکار کر دینا عصبیت ہے اور بغیر کسی محکم دلیل کے حقیقت کے خلاف کچھ کہہ دینا دل آزاری ہے۔

اس پہلو کو بھی جناب فروغ کاظمی نے خصوصی طور پر مدنظر رکھا ہے مجھے امید ہے کہ یہ کتاب منکرینِ تبرا کے لیے بھی کارگر اور مفید ثابت ہوگی۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

خاکپائے اہل بیتؑ

(سید زاہد احمد رضوی)

میثمی تاثر

مولانا میثم زیدی

تولا اور تبرا فروعِ دین میں شامل ہے۔

تولا کا مقصد حق کی حمایت ہے اور تبرا باطل سے اظہارِ برائت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف شیعہ ہی نہیں بلکہ ہر کلمہ گو تولا اور تبرا کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہے کیونکہ ہر مسلمان حضرت آدمؑ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ سے اظہارِ محبت کے ساتھ ساتھ ابلیس نمرود، فرعون، ابولہب اور ابوجہل وغیرہ سے اظہارِ نفرت کرتا ہے اور یہی اظہارِ نفرت حقیقت میں تبرا ہے۔

آج کل کچھ لوگ تبرے کو گالی کہہ کر اس بہترین عمل کو بدنام کرنے کی سازش کر رہے ہیں جبکہ قرآن مجید میں یہ لفظ کئی مرتبہ استعمال ہوا ہے جس کے حوالے اس کتاب میں موجود ہیں تو کیا قرآن میں (نعوذ باللہ) گالیاں موجود ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ تبرا عربی زبان کا لفظ ہے اور کسی بھی لغت میں گالی کو تبرا نہیں کہا گیا بلکہ عربی میں گالی کو "سب" کہتے ہیں نہ کہ "تبرا"۔ بہر حال ہم شیعیانِ اہلبیتؑ پیغمبر اسلام اور ان کی آل سے تولا اور ان کے دشمنوں سے تبرا کرنا اپنا ایمان جانتے ہیں۔

جناب فروغ کاظمی صاحب جو ایک عرصے سے اپنی مسلسل تحریروں کے ذریعہ دشمنانِ اہلبیتؑ کو دنداں شکن جواب دے رہے ہیں ان کی باقی کتابوں کی طرح یہ کتاب "حقیقتِ تبرا" بھی بہت ہی مدلل کتاب ہے اور میری نظر میں سوئے ہوئے لوگوں کو جگانے کے لیے بہت کافی ہے لیکن جن کا سونا ہی بناوٹی ہو انھیں بیداری کی کسوٹی پر پرکھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

خداوند عالم سے دعا ہے کہ وہ جناب فروغ کاظمی صاحب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

سید حسن متقی میثم زیدی (ایم اے۔ بی ایس سی۔ ایل ایل بی)

تولّا اور تبرّا

"محبت اور نفرت" انسانی سرشت کے دو اہم جز ہیں یعنی تولّی اور تبرّا کا عنصر انسان کے اندر فطرتاً کارفرما ہوتا ہے، جس کی تعبیر علماء نے میلانِ نفس اور اعراضِ قلب سے کی ہے۔ چنانچہ غیر ارادی یا غیر شعوری طور پر جب انسان کا دل کسی پسندیدہ شے کی طرف خود بخود کھنچنے لگتا ہے تو اس کیفیت کو عام اصطلاح میں محبت کہتے ہیں اور جب یہی دل کسی شے کی طرف سے بیزار ہو جاتا ہے یا اُچٹ جاتا ہے تو اس کی تعبیر "تبرّا" سے کی جاتی ہے جس کا آخری حصہ یہ لعنت و ملامت ہے

کائنات کی کوئی بھی شے خواہ وہ معنوی ہو یا مادی، جزوی ہو یا کلی، ملکی ہو یا ملکوتی، نوری ہو یا ناری، شخصی ہو یا اجتماعی، جسمانی ہو یا روحانی، دینی ہو یا دنیاوی، جب اُسے محکمۂ نفس کی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے تو اس کی تصویر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور دل اس کی طرف بے اختیار کھنچنے لگتا ہے یا اس سے بیزار ہو کر اسے اپنے اندر جگہ دینے سے انکار کر دیتا ہے، ان دونوں صورتوں میں پہلی صورت کا نام محبت (تولّی) اور دوسری صورت کا نام نفرت (تبرّا) ہے۔

تولّی اور تبرّا جس طرح اپنے وجود میں اشیاء کی ان کیفیات و خصوصیات کے تابع ہیں جن کی بنا پر محبت اور نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اسی طرح اپنی مقدار و منزل میں بھی انھیں کیفیات کے پابند ہیں اور انھیں کیفیات سے ان کی حد بندی ہوتی ہے نیز انھیں کی بنیاد و اساس پر ان کے درجات کا تعین ہوتا ہے چنانچہ اس اصول کے تحت جو حقیقی ذات سب سے پہلے محبت کی مستحق ہے وہ ذات باری تعالیٰ ہے جو اپنے صفات و کمالات کے اعتبار سے کامل و اکمل ہے اور اس کی ہر صفت جلال و جمال، ہر نمونۂ قدس و کمال، ہر دلیل عظمت و بزرگی، ہر نشانیٔ رحمت و رافت اس بات کی مقتضی ہے کہ

اس سے بے پناہ محبت کی جائے، ایسی محبت کہ جس کی نہ تو کوئی انتہا ہو اور نہ ہی کوئی حد معین ہو۔ حقیقتاً یہ محبت وہ ہے جو انسان کو "عبادت و عبدیت" کا خوگر بنا دیتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ محبت کا اولین حق ذات واجب کے لیے ہے جو تمام صفات و کمالات کا سرچشمہ ہے۔ اس کے بعد جس ذات میں بھی محبت کا کوئی سبب پایا جاتا ہے وہ دراصل اسی ذات واجب کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے، سارے امورِ خیر کا سلسلہ اسی کی ذات پر منتہی ہوتا ہے اور ساری زندگیوں کا آغاز اسی کے چشمۂ رحمت سے ہوتا ہے۔ وہی کامل نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اور جو شخص بھی اس کی ذات پر کسی شے کو مقدم کرتا ہے وہ عقل کا دشمن اور قانونِ منطق کا مخالف ہے کیونکہ ممکن واجب سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور معلول علت پر مقدم نہیں ہو سکتا۔ ایسی نازیبا حرکت پر پروردگارِ عالم مواخذہ بھی کر سکتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:۔

"قُل إن کانَ آباؤُکُم وابناؤُکُم وَاِخوانُکُم وَاَزواجُکُم وَعشیرَتُکُم وَاموالٌ اقتَرَفتُمُوها وَتِجارَةٌ تَخشَونَ
کَسادَها وَمَساکِنُ تَرضَونَها اَحَبَّ اِلَیکُم مِنَ اللهِ وَرَسُولِه وَجِهادٍ فی سَبیلِه فَتَرَبَّصُوا حَتّیٰ یَأتِیَ اللهُ بِاَمرِه وَاللهُ لا یَهدِی القَومَ الفٰسِقِین" (التوبہ آیت ۲۴)

(اگر تمھارے آباء، اولاد، برادران، ازواج، عشیرہ و اموال، تجارت، مکانات اللہ و رسولؐ اور جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ محبوب ہیں تو تم حکم الٰہی کا انتظار کرو ۔۔۔ اللہ فاسق قوم کی ہدایت نہیں کرتا)

اب چونکہ صفات واجب کی تحدید غیر ممکن ہے اور اس کی حد بندی نہیں کی جا سکتی تو اس کے زیر اثر پیدا ہونے والی محبت کو بھی محدود نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ کسی حد تک کیوں نہ پہونچ

جائے اسے "غلو" کا نام نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ غلو حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے اور اس کے صفات و کمالات کی کوئی حد معین نہیں ہے۔

اس کے برخلاف کسی شے سے نفرت اور بیزاری اس بات کی کھلی ہوئی علامت ہے کہ روح اس سے بھاگتی ہے اور اس سے پناہ چاہتی ہے۔ نفرت اور بیزاری عمومی طور پر انسان کے دل میں اس وقت جنم لیتی ہے جب وہ ظلم کا چہرہ دیکھتا ہے یا ایسے ظالموں پر اس کی نگاہ تصور مرکوز ہوتی ہے جنھوں نے ماضی یا حال میں ظلم کو اپنا نصب العین قرار دیا ہو۔ ضمیر انسانی انسان کے دل میں ایسے لوگوں کی طرف سے نفرت کا جذبہ پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ انسان ہر ظالم سے نفرت کرنے لگتا ہے خواہ وہ خود کیوں نہ ہو۔

اللہ کی محبت کے اعتبار سے ہر انسان ایک الگ درجہ رکھتا ہے اس لیے کہ محبت اگرچہ ذاتی اوصاف و خصوصیات کی بنا پر پیدا ہوتی ہے لیکن انسان کے دل میں اس کی جگہ علم و اطلاع کی بنیاد پر نکلتی ہے جس انسان کو ان خصوصیات کا جس قدر علم ہوگا اتنی ہی اس کی محبت شدید ہوگی اور چونکہ تمام افراد امت مسلمہ اللہ کی معرفت میں یکساں نہیں ہیں اس لیے ان کی محبت بھی یکساں نہیں ہو سکتی، ہر شخص کا ایک الگ حصہ ہوگا اور ہر شخص کا ایک الگ درجہ ـــــ نہ کوئی شخص کسی شخص کے علم میں شریک ہو سکتا ہے اور نہ کسی کی معرفت و محبت برابر ہو سکتی ہے۔

یوں تو اللہ کی محبت ہر انسان میں بقدر علم و معرفت پیدا ہو سکتی ہے لیکن یہ محبت نتیجہ خیز اسی وقت ہوگی جب اس کا تعلق طرفین سے ہوگا اس لیے انسان کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے اندر ایسے کمالات پیدا کرے جس کی بنیاد پر خدا بھی اس سے محبت کرنے لگے جیسا کہ اس نے خود وعدہ کیا ہے کہ:

"اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو نبیؐ کا اتباع کرو تاکہ اللہ بھی تم سے محبت کرنے

لگے"[1]

ایسے محبان الوہیت کی صف میں سرِفہرست امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا نام آتا ہے جنھیں پیغمبر اسلام نے فتح خیبر کے موقع پر اسی صفت سے پہچنوایا بھی تھا کہ "کل علَم ایسے کو دوں گا جو مرد ہوگا، کرار و غیر فرار ہوگا، خدا اور رسولؐ کا دوست ہوگا اور خدا و رسولؐ اس کے دوست ہوں گے"

یہ حدیث اپنے تمام اسناد کے ساتھ شیعوں اور سنیوں کی مستند و معتبر کتابوں میں موجود ہے اور اپنی شہرت کی بنا پر کسی حوالے کی محتاج نہیں ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جب محبت طرفین کی طرف سے ہوگی تو بندۂ خدا کسی عنایت و رحمت سے محروم نہیں رہے گا، فضیلتیں اس کے گرد حلقہ بگوش ہوں گی اور تقرب کی وہ منزل ہوگی جس کی نقشہ کشی حدیث قدسی کے حوالے سے امام بخاری نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"میرا بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے چاہنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کے لیے ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان کا درجہ پیدا کر لیتا ہوں۔ وہ میرے ہی ذریعہ سنتا ہے، میرے ہی ذریعہ دیکھتا ہے، میرے ہی وسیلے سے دشمن پر حملہ کرتا ہے اور میرے ہی وسیلے سے قدم آگے بڑھاتا ہے۔ جب وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے دے دیتا ہوں اور جب وہ کسی چیز سے پناہ چاہتا ہے تو میں اسے بچا لیتا ہوں"[2]

درحقیقت یہی اللہ کا مقرب بندہ ایک واسطہ بن جاتا ہے جس کے ذریعہ لوگ اللہ سے

---

[1] آل عمران - ۳۱

[2] بخاری ج، ص ۱۹۰

قریب ہوتے ہیں، دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ اہل ایمان کی نجات و فلاح کا سامان فراہم ہوتا ہے اور آسمانی برکتیں نازل ہوتی ہیں نیز یہی خدا کا محبوب و مقرب بندہ خدا کے بعد محبت (تولّا) کا حقدار ہے جیسا کہ بعض کتب صحاح میں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد ملتا ہے۔

"اللہ سے محبت کرو کہ وہ تمھیں رزق عطا کرتا ہے، مجھ سے محبت کرو کہ اللہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میرے اہلبیت سے محبت کرو کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں"[1]

یہ پیغمبری حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہلبیتؑ سے محبت کا صریحی حکم اپنی اُمّت کو دیا ہے لہٰذا جو بھی مسلمان اہل بیت اطہارؑ سے محبت کا دعویٰ کرے گا اس کے دل میں اہل بیتؑ کے دشمنوں سے نفرت و بیزاری کا جذبہ ضرور ہوگا جسے عرف عام میں تبرا بھی کہا جاسکتا ہے۔

رسول اکرمؐ کی شخصیت میں محبت کے لاتعداد اسباب و مقتضیات پائے جاتے ہیں جن میں بعض کا تعلق آپ کا اپنے پروردگار سے گہرے ربط کی بنا پر ہے اور بعض کا تعلق آپ کے فضائل و مناقب سے ہے۔ آپ کی شخصیت میں اگر طینت و اصل کی پاکیزگی، خلقت و اخلاق کی بلندی، ولادت و نشو ونما کی عظمت، اخلاق و نفسیات کی رفعت، کرامات کی کثرت اور صفات و کمالات کی جامعیت سے قطع نظر بھی کر لیا جائے اور صرف یہ دیکھا جائے کہ آپ کی ذات اقدس اس کائنات کے لیے سبب تخلیق ہے۔ آپ نہ ہوتے تو زمین کا فرش اور آسمانوں کی بلندی نہ ہوتی، انسان قابل ذکر مخلوق نہ ہوتا اور دنیا میں کسی شے کا وجود نہ ہوتا۔ آپ وجود کی غرض و غایت اور اللہ کے بعد ولایت عامہ کے حقدار ہیں، تو اتنا اعتبار بھی آپ کی ذات اقدس

---

[1] صحیح ترمذی ج ۱۲ ص ۲۰۱، مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۳۹۔ تاریخ بغداد ج ۴ ص ۱۶۰۔

سے محبت کے لیے کافی ہے بلکہ اس امر کا مستحق ہے کہ آپ سے اتنی شدید محبت کی جائے جو اپنے جسم و نفس، اہل و عیال، مال و دولت، آباء و اولاد اور برادران و ازواج وغیرہ سے نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ جس طرح امت مسلمہ اللہ کی محبت میں یکساں نہیں ہے اسی طرح رسول اکرم کی محبت میں بھی یکساں نہ ہوگی۔ یہاں بھی معرفت کے اختلاف کے اعتبار سے محبت کے درجات میں اختلاف ہوگا جیسا کہ امام قرطبی کا بیان ہے کہ:۔

"جو شخص بھی حضور اکرمؐ پر ایمان لایا ہے وہ اپنے نفس کو حضور کی محبت سے خالی نہیں پاسکتا۔ اس کے بعد لوگ محبت میں مختلف ہیں، بعض محبت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں اور بعض ادنیٰ درجہ پر۔ جیسے وہ افراد جو خواہشات میں غرق اور دنیا داری میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن ان میں بھی بہت سے ایسے ہیں جن کے سامنے حضرتؐ کا ذکر آتا ہے تو زیارت کے لیے تڑپ جاتے ہیں اور زیارت ان کی نظر میں اولاد و مال سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ وہ اس راہ میں ہر قربانی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اس کا احساس اپنے نفس کے اندر بغیر کسی خارجی محرک کے پاتے ہیں بلکہ بعض لوگ تو ایسے ہیں جو آپ کی قبر مطہر کی زیارت اور آپ کے آثار مقدسہ کے مشاہدہ کے لیے بے چین رہتے ہیں اور ہر قربانی دینے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ محبت پائدار نہیں ہوتی بلکہ مسلسل غفلتوں کی بنا پر زائل بھی ہو جاتی ہے۔"[1]

انس بن مالک نے حضور اکرمؐ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:۔

"خدا کی قسم کوئی شخص بھی اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک باپ بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں"[2]

---

[1] فتح الباری ابن حجر ج ۱ ص ۵۰۔۵۱ [2] بخاری ج ۱ ص ۹، مسلم ج ۱ ص ۴۹
مسند احمد ج ۴ ص ۱۷۷، ۲۰۷، ۲۷۵

واضح رہے کہ یہی روایت کچھ لفظوں کی الٹ پھیر کے ساتھ ابو ہریرہ سے بھی نقل ہوئی ہے لیکن مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہے اور ایک روایت میں ہے کہ خدا و رسولؐ جس کی نظر میں تمام دنیا سے محبوب ہوں وہ ایمان کی حلاوت سے بہرہ یاب ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں بھی تقریباً اسی قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں"[1]

عبداللہ بن ہشام راوی ہیں کہ میں حضور اکرمؐ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ آپ عمر بن خطاب کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ عمر نے آپ سے فرمایا کہ آپ میری نظر میں میرے نفس کے علاوہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب ہیں تو آپ نے فرمایا 'یہ کچھ نہیں' جب تک میں تمھارے نفس سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔ عمر نے کہا لیجئے یہ بھی ہوگیا تو آپ نے فرمایا، اے عمرؓ اب......"[2]

نصیبی نے "فوائد" میں ابو لیلیٰ انصاری کے طریق سے نقل کیا ہے کہ:۔

"پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ کوئی شخص اس وقت تک صاحب ایمان نہیں بن سکتا جب تک میں اس کے نفس سے زیادہ، میری عترت اس کی عترت سے زیادہ اور میرے اہل اس کے اہل سے زیادہ محبوب نہ بن جائیں"[3]

امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں رقم طراز ہیں کہ:۔

"آلِ رسولؐ کے لیے دعا ایک عظیم منصب ہے اور اسی لیے اس دعا کو تشہد کا تتمہ بنا دیا گیا ہے اور یہ تعظیم کسی اور کے حق میں نہیں وارد ہوئی لہذا انھیں باتوں سے پتہ چلتا ہے

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۱۰۔۱۱ و ج ۷ ص ۰۲، مسلم ج ۱ ص ۴۸، ترمذی ج ۱۰ ص ۹۱، مسند احمد ج ۳ ص ۱۷۲، ۱۷۴، ۲۰۸
[2] بخاری ج ۸ ص ۲۱۸
[3] شعب الایمان بیہقی ج ۲ ص ۱۱

کہ آلِ محمدؐ کی محبت ایک امر واجب ہے"[1]

اسی قسم کی اور باتیں بھی علمائے اسلام کے بیانات کے ذیل میں پائی جاتی ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کی محبت کے بعد آپ کے اہل بیتؑ کی محبت کا درجہ ہے۔ آپ کی محبت اہل بیتؑ کی محبت سے جدا نہیں ہو سکتی اور نہ ساری محبتیں خدا کی محبت سے الگ ہو سکتی ہیں۔ یہی فیصلہ کتاب و سنت کا ہے اور یہی اعلان عقل و منطق کا۔

یوں تو پیغمبر اسلام اور آپ کے اہل بیت کے اتحاد کے سلسلے میں بے شمار حدیثیں پائی جاتی ہیں لیکن ہم ان میں سے صرف چند کو بطور نمونہ یہاں نقل کریں گے۔

۱۔ جس کا میں مولا ہوں، اس کے علیؑ بھی مولا ہیں ـــ یہ حدیث سو سے زیادہ طریقوں سے وارد ہوئی ہے۔

۲۔ علیؑ مجھ سے ہے اور میں علیؑ سے ہوں اور وہ میرے بعد ہر صاحب ایمان کے ولی و حاکم ہیں (عمران ابن حصین)

۳۔ جو مجھے، حسنینؑ کو اور ان کے ماں باپ کو دوست رکھے گا وہ روز قیامت میرے ساتھ میرے درجہ میں ہوگا (ابو ہریرہ)

۴۔ میری شفاعت صرف ان کے لیے ہے جو میرے اہل بیت سے محبت کریں۔

۵۔ جو حسنینؑ کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے۔

۶۔ جو حسنینؑ کو دوست رکھتا ہے وہ میرا دوست ہے اور جو ان کی طرف سے اپنے دل میں دشمنی رکھتا ہے وہ میرا دشمن ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر ج ۷، ص ۳۹۱

، حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ خدایا اسے دوست رکھ جو حسینؑ سے محبت کرے۔ (حضرت عائشہ) (یعلی بن مرہ)

۸۔ خدایا میں حسنینؑ کو دوست رکھتا ہوں تو بھی انھیں اور ان کے چاہنے والوں کو دوست رکھ۔ (ابوہریرہ)

۹۔ جو مجھ سے محبت کرتا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ حسنینؑ سے محبت کرے (ابوہریرہ)

۱۰۔ اللہ میرا مولا اور میرے نفس سے اولیٰ ہے' اس کے سامنے میرا کوئی حکم نہیں ہیں صاحبانِ ایمان کے نفسوں سے اولیٰ ہوں۔ میرے سامنے ان کا کوئی حکم نہیں ہے اور جس کا میں حاکم مطلق ہوں اس کے علیؑ بھی حاکم ہیں' علیؑ کے سامنے اس کا کوئی حکم نہیں چل سکتا۔"

۱۱۔ میرے اہل بیتؑ کی مثال تم میں سفینۂ نوحؑ کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جس نے اسے چھوڑ دیا وہ ڈوب گیا۔

۱۲۔ میرے اہل بیتؑ کی مثال تم میں باب حطہ بنی اسرائیل کی سی ہے جو اس میں داخل ہوا اس کے گناہ بخش دئے گئے۔

۱۳۔ اے علیؑ جو تمھارا دوست ہے وہ میرا دوست ہے اور جو تمھارا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔

۱۴۔ جو علیؑ کا دوست ہے وہ میرا دوست ہے اور جو میرا دوست ہے وہ خدا کا دوست ہے۔

۱۵۔ جو علیؑ کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے اور جو میرا دشمن ہے وہ خدا کا دشمن ہے۔

۱۶۔ جو علیؑ و فاطمہؑ اور حسنینؑ کو دوست رکھے وہ میرا دوست ہے اور جو ان کا دشمن ہے وہ میرا دشمن ہے۔

۱۷، حسنینؑ پر میرے ماں باپ قربان۔ میرے دوستوں کا فرض ہے کہ وہ ان سے محبت کریں۔

۱۸۔ میں تمھارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' ایک کتاب اللہ اور دوسرے میرے اہل بیتؑ۔ اگر تم ان سے تمسک رکھوگے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔

۱۹۔ جو مجھ سے توسل کا خواہاں ہے اور یہ چاہتا ہے کہ روز قیامت میری شفاعت کا حقدار بن جائے تو اس کا فرض ہے کہ وہ میرے اہل بیتؑ سے محبت کرے اور انھیں خوش رکھے۔

۲۰۔ علیؑ پرچمِ ہدایت' امام الاولیاء' نورِ صاحبانِ اطاعت اور اہلِ تقویٰ کا کلمہ ہے اس کا دوست میرا دوست ہے اور اس کا دشمن میرا دشمن۔

ان احادیث کے علاوہ بے شمار حدیثیں ایسی اور بھی ہیں جن میں محبت اہل بیت کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ محبت دین کی ضروریات' عقل کے فرائض اور محبت رسولؐ کے لوازم میں سے ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس محبت کی کوئی تحدید نہیں ہو سکتی اور نہ کسی خاص حد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ محبت اپنے وجود میں مخصوص اسباب وعلل کی تابع ہے اور انھیں اسباب کی بنا پر اس کے درجہ و مرتبہ کا بھی تعین ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب ہم ان اسباب وعلل' فضائل و کمالات کا احاطہ نہیں کر سکتے اور نہ تمام لوگ اپنے علم و عرفان میں مساوی ہی ہو سکتے ہیں تو کسی ایک حد و مرتبہ کا تعین کس طرح صحیح ہو سکتا ہے بلکہ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر محبت کے بے شمار اسباب میں سے کسی ایک سبب کو بھی گہری نظر سے دیکھا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ خدا' رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی محبت کا کوئی درجہ معین نہیں کیا جا سکتا اور اگر آپ کو تعین کا ہی شوق ہے تو آیئے آلِ اطہارؑ کی محبت کے علل و اسباب پر غور کیجئے اور پھر بتایئے کہ یہ اسباب کس حد تک محبت کے مقتضی ہیں۔

۱۔ اہل بیت علیہم السلام سرکارِ رسالت سے نسب اور دامادی دونوں طرح کا رشتہ رکھتے ہیں اور سرکارِ رسالت کا یہ کھلا ہوا اعلان ہے کہ "روزِ قیامت تمام نسبی اور صلبی رشتے منقطع ہو جائیں گے سوائے میرے رشتوں کے"۔

۲۔ اہل بیت علیہم السلام کو خدا اور رسولؐ اپنا محبوب سمجھتے ہیں اور تمام مخلوقات سے زیادہ ان سے محبت کرتے ہیں جیسا کہ حدیث 'خیبر' اور حدیث طیر وغیرہ سے واضح ہے۔

۳۔ اہل بیت علیہم السلام سے محبت رکھنے والا شخص پیغمبر اسلام کی اس دعا کا مستحق ہو جاتا ہے "خداوندا! ان کے دوست کو دوست رکھ' ان کے مددگار کی مدد کر' ان کے ناصر کی نصرت کر اور ان کے محب کو محبوب قرار دے۔

۴۔ اہل بیت علیہم السلام کی محبت بنصِ قرآن 'ختم نبوت کی اجرت ہے اور اس پر روزِ ازل سے تمام امت کا اجماع اور اتفاق ہے۔

۵۔ اہل بیت علیہم السلام کی محبت کے بارے میں روزِ حشر قدم قدم پر سوال کیا جائے گا "وقفوهم انهم مسئولون" اور بقول ابو سعید خدریؓ "مسئولون عن ولایة علیؑ"

مفسر کبیر واحدی کا بیان ہے کہ روزِ قیامت ہر شخص سے علیؑ اور اہل بیتؑ کی محبت کے بارے میں اس لیے سوال ہوگا کہ رسول اکرمؐ نے اپنی تمام خدمات کے عوض میں کسی اجرت کا تقاضا نہیں کیا اور اگر تقاضہ کیا ہے تو صرف اہل بیتؑ سے محبت کا۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص سے سوال ہوگا کہ اس نے اہل بیتؑ سے اس طرح محبت کی ہے یا نہیں جس طرح رسول اکرمؐ نے حکم دیا تھا۔

علامہ ابن حجر نے "صواعق محرقہ" میں ابو سعید خدری کی روایت کو نقل کرکے واحدی

کے اس جملے کا بھی اضافہ کیا ہے کہ "جس طرح رسول اکرمؐ نے حکم دیا تھا" درحقیقت کثیر روایات واحادیث کی طرف اشارہ ہے جن میں حضورِ اکرمؐ نے محبت اہل بیتؑ کی تاکید فرمائی ہے۔

ابو سعید خدری کی اس حدیث اور واحدی کی تشریح کو بہت سے علمائے اسلام نے نقل کیا ہے اور بعض نے تو حدیث ثقلین سے اس ذیل میں اس طرح استدلال کیا ہے کہ "اللہ روزِ قیامت تم سے سوال کرے گا کہ تم نے میرے بعد خدا کی کتاب اور میرے اہل بیتؑ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟

سبطِ جوزی نے تذکرہ صفحہ ۱۰ میں اس مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "روزِ قیامت لوگوں سے ولایت علیؑ کے بارے میں سوال ہوگا"۔

سید آلوسی نے اپنی تفسیر کی ۲۳ویں جلد کے صفحہ ۷۰ پر آیت مذکورہ کے ذیل میں بہت سے اقوال نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ روزِ قیامت عقائد و اعمال کے بارے میں سوال ہوگا اور عقائد میں راس الرئیس "لا الٰہ الا اللہ" ہے اور بلند ترین عقیدہ ولایتِ علی کرم اللہ وجہہ ہے"۔

۶۔ اہل بیت علیہم السلام قرآن کریم کے ہمسر و ہم پلہ ہیں جیسا کہ پیغمبر اسلام نے حدیث ثقلین میں ارشاد فرمایا ہے کہ یہی ائمہ ہدایت ہیں' یہی ہمسر قرآن ہیں' انھیں کے ذریعہ انسانی گمراہی سے نجات پاتا ہے اور یہی پاکیزہ زندگی کی رہنمائی کرتا ہے۔

۷۔ حضرت علی علیہ السلام کی محبت ایمان کی علامت ہے جیسا کہ سرکارِ دوعالم کا ارشاد ہے کہ "اے علیؑ! تمھارا دوست نہیں ہوگا مگر مومن اور تمھارا دشمن نہیں ہوگا مگر منافق" اس مضمون کی بے شمار حدیثیں ہیں یہاں تک کہ صحابۂ کرام نے اسی بات کی مبارکباد دی ہے جیسا کہ غدیرِ خم میں لاکھوں کے بھرے مجمع میں عمر بن خطاب نے کہا تھا "مبارک ہو مبارک ہو

یا علی آج آپ میرے اور ہر مومن کے مولا ہو گئے!"

یہی بات محب الدین طبری، دار قطنی اور ابن السمان وغیرہ نے اس واقعہ کے ذیل میں لکھی ہے کہ دو اعرابی باہم جھگڑا کرتے ہوئے آئے اور انھوں نے حضرت علیؑ سے کہا ــــ یا ابوالحسن! آپ ہم دونوں کے درمیان فیصلہ کر دیجیے۔ آپ نے فیصلہ کر دیا تو ان میں سے ایک نے طنزیہ لہجہ میں کہا "یہ ہمارے درمیان فیصلہ کریں گے" بس یہ سننا تھا کہ عمر بن خطاب کو غیض آگیا۔ جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور کہا، خدا تجھ پر لعنت کرے، جانتا ہے یہ کون ہیں؟ یہ میرے اور ہر مومن کے مولا ہیں۔ جو انھیں مولا نہیں مانتا وہ مومن نہیں ہے"

حضرت علیؑ کی محبت تمام افراد امت پر بلا استثنا واجب ہے اور ان میں اولیا، علما، صدیقین، شہدا نیز صالحین بھی شامل ہیں۔ اس بات کا صحیح اندازہ حاکم نیشاپوری کی نقل کردہ اس روایت سے ہوتا ہے جو انھوں نے "کتاب المعرفت" میں ابن مسعود سے کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا، اے عبداللہ میرے پاس ایک ملک آیا اور اس نے کہا " اپنے پہلے آنے والے رسولوں سے سوال کرو کہ انھیں کیوں مبعوث کیا گیا ہے؟ تو میں نے سب سے سوال کیا اور سب نے جواب دیا کہ آپ کی محبت اور علیؑ کی ولایت کی بنیاد پر۔"

حافظ ابونعیم اصفہانی نے اس حدیث کو یوں نقل کیا ہے کہ سرکار دو عالم نے فرمایا" جب مجھے معراج میں لے جایا گیا تو میں نے چوتھے آسمان پر یاقوت کا ایک محل دیکھا جبرئیل نے کہا یہ بیت المعمور ہے، اس میں نماز پڑھیے۔ اس کے بعد خدا نے تمام انبیاء کو جمع کر دیا اور وہ سب میرے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہو گئے، میں نے نماز پڑھائی۔ جب سلام سے فارغ ہوا تو ایک نمائندہ الہٰی آیا اور اس نے کہا" اے محمدؐ! اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ ان انبیاء سے سوال کیجیے کہ انھیں نبوت کا منصب کیوں دیا گیا ہے؟

میں نے سوال کیا اور سب نے بالاتفاق یہ جواب دیا کہ" آپ کی نبوت اور علیؑ کی ولایت کے طفیل میں"۔

ظاہر ہے کہ حضرت علیؑ کی یہ ولایت جس طرح کسی شخص کو مستثنیٰ نہیں کرتی اسی طرح کسی حالت و کیفیت کو بھی الگ نہیں کرتی، انسان کسی جگہ ہو، کسی عالم میں ہو، اس پر فرض ہے کہ وہ علیؑ کی محبت کو سینے سے لگائے رہے۔ حالات کی تبدیلی سے نفسیاتی کیفیات کا تبدیل ہونا ایک الگ بات ہے لیکن اہل بیت کی محبت میں ذرہ برابر بھی فرق کا پیدا ہونا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

۹۔ اہل بیت علیہم السلام کی محبت، جملہ اعمال و عبادات، صلات و طاعات اور حج و صیام وغیرہ میں ایک "شرط" کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ اکثر حدیثوں میں وارد ہوا ہے۔

۱۰۔ اہل بیت علیہم السلام میں ذاتی طور پر محبت کے جملہ اسباب و عوامل پائے جاتے ہیں۔ یہ اصل و نسل کے طاہر، حسب و نسب کے طیب، علم و حکمت کے مخزن، زہد و تقویٰ کے خوگر اور کمالات و فضائل کے مرکز ہیں اور چونکہ ان کی فضیلتوں کی کوئی حد معین نہیں ہے لہٰذا ان کی محبت بھی لامحدود ہونی چاہیے۔

ان تمام مذکورہ عوامل و اسباب کے علاوہ اور بھی ایسے بے شمار اسباب ہیں جن میں ہر سبب تن تنہا ایک مستقل محبت کا داعی ہے جو دلوں میں گھر کر لیتا ہے اور نفوس کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے ــــ اور ان سب باتوں سے بالاتر بات یہ ہے کہ اہل بیت علیہم السلام دنیا والوں کے لیے نجات کا ذریعہ ہیں، ان کا ابر کرم عام ہے، ان کی برکتیں لامحدود ہیں، یہ زمین و آسمان کے لیے وجہ بقا ہیں۔ ہر طبقۂ انسانی ان کے پرچم کے سائے میں امن و سکون کی زندگی گزار سکتا ہے اور اگر یہ نہ ہوتے تو اب تک دنیا قیامت سے ٹکرا کر تباہ و برباد ہو گئی

ہوئی چنانچہ علامہ عزیزی بھی "سراج" جلد ۳ کے صفحہ ۱۶۴ پر ایک روایت کے ذیل میں رقمطراز ہیں کہ:۔

"جب ساری کائنات رسول اکرمؐ کے طفیل میں خلق ہوئی ہے تو اس کی بقا بھی یقیناً آپ کے اہل بیت سے وابستہ ہوگی"

محمدؐ و آل محمدؑ کی حیات طاہرہ اور سیرت طیبہ میں محبت کے اسباب و عوامل پر غور و فکر کرنے کے بعد یہ فیصلہ آسان ہو جاتا ہے کہ "تولیٰ" اور "تبرّا" دونوں ہی جزو اسلام و ایمان اور ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ نہ تولیٰ کے بغیر تبرّا ممکن ہے اور نہ ہی تبرّا کے بغیر تولیٰ کی شرط پوری کی جا سکتی ہے کیونکہ قانون فطرت کے مطابق انسان جب کسی سے والہانہ محبت کرے گا تو اس کے مخالفین یا دشمنوں سے نفرت' بیزاری اور بے تعلقی کا اظہار بھی کرے گا اور اسی مسلم الثبوت قانون کے تحت شیعہ حضرات خدا کے بعد محمدؐ و آل محمدؑ سے بے پناہ محبت بھی کرتے ہیں اور دشمنان محمد و آل محمد سے اپنی دلی نفرت کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نفرت و بیزاری کے اظہار کی آخری منزل لعنت و ملامت ہے۔

تبرّا اور لعنت کی معنوی حیثیت

تبرّا "باب تفعّل" سے آیا ہے۔ اس کے معنی برارت چاہنا ہے یعنی فلاں ـــــ فلاں ـــــ فلاں سے میں دوری چاہتا ہوں اور اس بات کا خواہشمند ہوں کہ اللہ کی رحمت اُن سے دور رہے۔

اردو زبان کے لغت مثلاً لغات کشوری میں تبرّا کے معنی نفرت کرنا' بیزاری کا اظہار کرنا یا بیزار ہونا تحریر کئے گئے ہیں جبکہ فیروز اللغات وغیرہ میں تبرّا کے معنوں میں بے تعلق اختیار کرنا' نفرت کرنا اور لعنت بھیجنا وغیرہ مرقوم ہے۔ اسی طرح لعنت کے معنوں میں نفرین' پھٹکار' برا بھلا کہنا' کنارہ کشی اختیار کرنا' نفرت کرنا' بد دعا کرنا اور رحمت خداوندی سے دوری وغیرہ مرقوم ہے۔ اور یہی بات ہم اوپر تحریر کر چکے ہیں کہ تبرّا اور برارت سے مراد خدا و رسولؐ اور اہل بیت رسولؐ کے تمام دشمنوں اور ان کے دوستوں کے دشمنوں کو دشمن سمجھنا ہے جن میں سرفہرست وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے محمدؐ و آل محمدؑ پر مظالم کے دروازے کھولے اور ان کے حقوق پر ڈاکے ڈالے اور اس زمرہ میں وہ چھوٹی بڑی شخصیتیں بھی آتی ہیں جو خدا اور اس کے رسول کے لیے بیزاری کا سبب بنیں یا آل رسول کے لیے اذیتوں کا باعث قرار پائیں اور اس سے گناہ اور گنہگاروں کو دشمن سمجھنا بھی مراد ہے کیونکہ عبادت گزاروں اور اطاعت شعاروں سے دوستی تولیٰ میں شامل ہے۔

ان دونوں واجبات خدا کی اہمیت اور عظمت کے بارے میں جن کا شمار ارکان دین میں ہوتا ہے بہت سی قرآنی آیات موجود ہیں جنھیں ہم آئندہ صفحات میں اجمالی طور پر پیش کریں گے۔ اختصار کو نظر میں رکھتے ہوئے یہاں فی الحال تبرّا کا ائمہ اطہارؑ کی چند احادیث پر اکتفا مناسب ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ:۔

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے اوّل نماز' دوسرے روزہ' تیسرے حج' چوتھے زکوٰۃ اور پانچویں ولایت ـــــ اور ان چیزوں میں سے کسی کے بارے میں اس

طرح حکم صادر نہیں ہوا جس طرح ولایت علیؑ کے بارے میں حکم دیا گیا ہے"[1]

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا:

"دین کی بنیاد اہل بیت رسولؐ اور ان کے دوستوں سے دوستی پر قائم ہے اور ان کے دشمنوں سے دشمنی رکھنا اطاعت واتباع میں شامل ہے"[2]

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حضرت رسول خدا (صلعم) نے اپنے اصحاب سے ایک دن پوچھا کہ ایمان کا سب سے مستحکم رشتہ جو صاحب عمل کو نجات دلائے اور اسے سعادت ابدی پر فائز کرے کون سا ہے؟ اس استفسار پر کسی نے جواب دیا نماز، کسی نے کہا روزہ، کسی نے کہا زکوٰۃ، کسی نے کہا حج اور عمرہ اور کسی نے کہا جہاد ـــ آنحضرتؐ نے فرمایا تم لوگوں نے جن چیزوں کے بارے میں بتایا ہے وہ چیزیں اپنی جگہ فضیلت تو رکھتی ہیں لیکن ایمان کے لیے اس وقت تک محکم وسیلہ نہیں بن سکتیں جب تک ایمان کی بنیاد خدا اور اس کے رسولؐ سے دوستی اور خدا اور رسولؐ کے دشمنوں سے بیزاری پر نہ ہو"[3]

"قوانین اسلامی" کے ذیل میں امام رضا علیہ السلام نے تحریر فرمایا ہے کہ:

"جن لوگوں نے محمدؐ وآل محمدؐ پر مظالم ڈھائے ہیں ان سے بیزاری واجب ہے۔ ناکثین قاسطین اور مارقین یعنی جنگ جمل میں حضرت علیؑ سے لڑنے والوں، صفین میں معاویہ کی طرف سے جنگ کرنے والوں اور نہروان کے خارجیوں سے بیزاری اور اسی طرح ان لوگوں سے بیزاری جنھوں نے ولایت علیؑ سے انکار کیا، واجب ہے۔ اور اس کے برعکس حضرت علیؑ کا اتباع کرنے

[1] و [2] اصول کافی ج ۲ ص ۱۸ [3] اصول کافی ج ۲ ص ۱۲۵

والوں مثلاً سلمان، ابوذر، مقداد، عمار، ابوالہیثم، سہل بن حنیف، عبادہ بن صامت، ابوایوب انصاری، خزیمہ بن ثابت اور ابوسعید خدری وغیرہ سے دوستی واجب ہے"[1]

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا:

"جو شخص حالت ایمان میں خدا سے ملاقات کا مشتاق ہو وہ آل رسولؐ سے محبت اور دوستی رکھے اور ان کے دشمنوں سے بیزاری اختیار کرے"[2]

صادق آل محمدؐ کی ایک حدیث یہ بھی ہے:

"قیامت کے دن منادی ندا دے گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنھوں نے خدا و رسولؐ اور اہل بیت کی مخالفت اور ان سے مزاحمت کے طور طریقے اپنائے تھے۔ اس پر کچھ لوگ کھڑے ہو جائیں گے جن کے چہروں پر گوشت نہیں ہوگا اور وہ اقرار کریں گے کہ ہم نے خدا و رسولؐ کو آزردہ کیا، ان کی مخالفت کی اور ان کے اہل بیت سے دشمنی کے مرتکب ہوئے ـــ اس پر حکم ہوگا کہ انھیں اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے"[3]

اس مختصر سی گفتگو میں "تبرا" اور "لعنت" کی معنوی حیثیت پوری طرح اجاگر اور حقیقت مکمل طور پر آشکار ہے مزید کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

بے بنیاد تہمت

سُنّی مسلمانوں کا ایک مخصوص فرقہ اپنی کج فہمی کی بنا پر "تبرا" اور "لعنت" کو گالیوں

[1] عیون اخبار الرضاؑ ص ۲۶۸ [2] اصول کافی ج ۲ ص ۱۳۶

سے تعبیر کرتا ہے اور اس کے ارتکاب کے سلسلے میں شیعوں کو مورد الزام قرار دے کر ان پر یہ بے بنیاد تہمت لگاتا ہے کہ "تبرا کی آڑ میں شیعہ حضرات گالیاں بکتے ہیں"۔

اس اتہام کے ذیل میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ "گالیاں تو درکنار شیعہ مسلک میں "گانے بجانے" یا آلاتِ غنا سے لطف اندوزی کو بھی ایک غیر شرعی، مذموم اور حرام فعل قرار دیا گیا ہے لیکن اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ شیعہ حضرات ان ناپسندیدہ عناصر پر لعنت ملامت ضرور کرتے ہیں جن پر لعنت کرنے کا حکم خدا اور اس کے رسولؐ نے دیا ہے یا پھر وہ لوگ شیعوں کی لعنت کا نشانہ بنتے ہیں جو منافقت کی نقاب اپنے چہروں پر ڈال کر اپنے مفاد کی خاطر داخلِ اسلام ہوئے اور اپنے منافقانہ طرزِ عمل سے اسے تہس نہس کر دیا یا وہ لوگ ہدفِ ملامت بنتے ہیں جنھوں نے رسولِ اسلام کے بعد اسلامی اقتدار کو غصب کیا اور آلِ رسولؐ کی زندگیوں میں زہر گھولا، انھیں طرح طرح کی اذیتیں دیں، ان پر مظالم کے مسلسل پہاڑ توڑے انھیں ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا اور حضور اکرمؐ کے نواسوں کو بے دردی اور بے رحمی سے قتل کیا۔

گالیاں بکنے کے سلسلے میں شیعوں پر عاید کی جانے والی اس تہمت کے پس پردہ منجملہ دیگر وجوہ کے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ منافقین اوّل کی ممتاز فرد ابوسفیان کے بیٹے معاویہ کے دورِ حکومت میں پیغمبر اسلام کے حقیقی جانشین، چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام پر ستر ہزار منبروں سے بر سرِ عام سب و شتم کیا جاتا تھا اور ان کے قریبی عزیزوں کے سامنے انھیں گالیاں دی جاتی تھیں لہٰذا معاویہ کے پیرو اور ہمنوا اس کے داغدار دامن سے گندگی کے اس بدنما داغ کو دھونے کے لیے شیعوں پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ شیعہ صحابہ کی شان میں گالیاں بکتے ہیں حالانکہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ معاویہ صاحب نے جس انداز

میں تبرا کو گالیوں کی شکل میں تبدیل کیا وہ ان کا ذاتی کارنامہ ہے جس کی مثال اسلامی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔ چنانچہ اس ذیل میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رقمطراز ہیں کہ:۔

"یہ ایک نہایت مکروہ بدعت معاویہ کے عہد میں شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں بر سرِ منبر حضرت علیؑ پر سب و شتم کی بوچھار کرتے تھے حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبرِ رسولؐ پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؑ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتے دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین اور اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا"[1]

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ معاویہ صاحب نے اپنے دورِ حکومت میں لفظ تبرا کو گالیوں کے پیکر میں اس طرح ڈھالا کہ ان کے اور ان کے گورنروں کے سامنے نہ مسجد نبوی کی کوئی عظمت رہ گئی، نہ منبرِ رسولؐ کا احترام باقی رہا، نہ حضورؐ کے روضۂ اقدس کی منزلت رہ گئی اور نہ ہی نماز جمعہ کی فضیلت برقرار رہ سکی اور غالباً انھیں افسوسناک حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سرکارِ دو عالم نے واضح الفاظ میں یہ فرما دیا تھا کہ:۔

"گالی دینے والوں پر خدا نے جنت کو حرام قرار دیا ہے اور اگر گالیوں کے مرتکبین کی چھان بین کی جائے تو یقیناً وہ زنا زادے ثابت ہوں گے یا پھر ان کے نطفوں میں شیطان

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۶۲ بحوالہ طبری ج ۴ ص ۱۸۸، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۳۴، ۱۵۴ البدایہ ج ۸ ص ۲۵۹ و ج ۹ ص ۸۰۔

کی شرکت کا پتہ چلے گا"[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:۔

"گالیاں دینے والا شخص جفاکار ہے اور جفاکار ہر حالت میں جہنم کا سزاوار ہے"[2]

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ:۔

"گالیاں دینے والا ظالم ہے اور وہ اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ دوسروں کا گناہ بھی اپنی گردن پر لے لیتا ہے"[3]

جو انسان اسلام کی تاریخ سے ذرا بھی واقف ہو گا وہ اس سچائی کو تسلیم کرے گا کہ "گالی آمیز تبرا" معاویہ کی ایجاد ہے جسے بنی امیہ کے بیشتر خلفا نے جاری رکھا پھر دور بنی عباس میں بھی اس کا اعادہ کیا جاتا رہا لیکن بعد کے سلاطین نے اس میں اتنی تبدیلی کر دی کہ وہ علیؑ کے بجائے علیؑ کے پیروؤں کا نام لینے لگے چنانچہ تبرا کی محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں۔ ایک شخص منبر پر جاتا تھا اور آواز لگاتا تھا "فلاں ابن فلاں رافضی بود" حاضرین جواب دیتے تھے "بر پدرش لعنت"۔ اس طرح صدیاں گزرتی چلی گئیں اور غلامان علیؑ یہ سب دیکھتے اور سنتے رہے۔ آخر وہ وقت بھی آیا کہ انتزاع سلطنت عباسیہ پر جہاں مختلف حصوں میں جداگانہ سلطنتیں قائم ہوئیں وہاں ایشیا و افریقہ میں بعض چھوٹی بڑی شیعہ حکومتیں بھی وجود میں آگئیں۔ شیعوں کے صبر و ضبط کا پیمانہ ہر عہد میں چھلکتا رہا تھا مگر انھیں مجبوراً تبرا کی آوازیں سننا پڑی تھیں اب جو اظہار خیال کی آزادی ملی تو انھوں نے نام بدل کر تبرا خوانوں کی آوازوں میں آوازیں ملائیں اور ان کی آواز بازگشت اطراف و جوانب میں سنائی دینے لگی۔ اب شیعوں پر جنگ صحابہ کا الزام بھی عاید

[1] اصول کافی باب البذاء ج ۲ ص ۳۲۳ [2،3] اصول کافی ج ۲ ص ۲۶۰

کر دیا گیا گویا ان صحابہ کی بڑی قیمت تھی اور علیؑ کی کوئی قیمت نہ تھی۔

شام کی مملکت میں حضرت علیؑ پر تبرا ہونے کا ذکر بیشتر مورخین نے کیا ہے اور اسی لیے حضرت امام حسنؑ نے معاویہ سے صلح کی شرطوں میں یہ شرط بھی رکھی تھی کہ آئندہ حضرت علیؑ پر سب و شتم نہیں کیا جائے گا مگر معاویہ نے اس کے بالکل برعکس عمل کیا اور حضرت علیؑ سے اظہار برارت کو اپنی بیعت کا جزو بنا لیا۔ اس پر بنی تمیم کے ایک شخص نے اعتراض کرتے ہوئے کہا:۔

"ہم زندوں کی اطاعت کریںگے مگر مُردوں سے برارت نہیں کریںگے"۔

اس پر معاویہ زیاد کی طرف متوجہ ہوا اور بولا اس شخص کو اچھائی کی طرف وصیت کرو[1] چنانچہ زیاد نے اس کو اسی وقت قتل کر دیا۔

یہ ہے تبرا کی مختصر روداد ــ لیکن معترضین اگر اسی بات پر بضد ہیں کہ تبرا میں شیعہ گالیوں کا استعمال کرتے ہیں تو انھیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اسلام کا کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" بھی (معاذ اللہ) گالی ہے کیونکہ یہ کلمہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو خدائے واحد کے اقرار اور دیگر تمام جھوٹے اور خود ساختہ خداؤں سے انکار' ان سے برارت یعنی تبرا کی ترغیب دیتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ استغفر اللہ خدا بھی گالیاں بکتا ہے کیونکہ قرآن اسی کے کلام کا مقدس ترین مجموعہ ہے اور جب کسی مسلمان کے ذہن میں گالیوں کا یہ تسلسل پیدا ہو جائے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا اسلام خود بخود ختم ہو جائے گا۔

اور اگر معترضین کی طرف سے یہ تاویل پیش کی جاتی ہے کہ "انکار" اور "تبرا" میں فرق ہے تو کلمہ رد شرک اس تاویل کو ہوا میں اڑا دے گا جس میں ارشاد ہوا ہے کہ:۔

[1] عقد الفرید ج ۲ ص ۳۳۱

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اعوذ بک من ان اشرک بک شیئاً و انا اعلم به واستغفرک لما لا اعلم به تبت عنه و تبرات ان اشرک و بمعاصی کلھا

"خداوندا! میں پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تیرے ساتھ کسی کو شریک کروں اور میں استغفار و توبہ و تبرا کرتا ہوں شرک اور عصیاں سے"۔

تبرّا کی تاریخی حیثیت

تاریخیں گواہ ہیں کہ "بغض علیؑ" میں "گالی آمیز" تبرا معاویہ ابن ابوسفیان کی ایجاد ہے اور شیعان علیؑ اس لعنتی ایجاد کو تقریباً تین سو سال تک انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ اس کے بعد وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ جب حقیقی معنوں میں باقاعدہ شیعہ حکومت کا قیام عمل میں آیا تو معزالدولہ نے باقی ماندہ خلفاء کی قوتوں کو ختم کرنے کے ساتھ ہی بغداد میں شیعیت کی تبلیغ بھی شروع کر دی اور ۳۵۱ھ میں بغداد کی جامع مسجد کے بیرونی پھاٹک پر یہ عبارت لکھوائی کہ:۔

"معاویہ بن ابوسفیان، غاصبین فدک، امام حسنؑ کو روضۂ رسولؐ میں دفن کرنے سے روکنے والوں، ابوذر غفاریؓ کو جلاوطن کرنے والوں اور عباسؓ کو شوریٰ سے خارج کرنے والوں پر خدا کی لعنت ہو"۔

یہ پہلا جوابی اقدام تھا جو کسی شیعہ کی طرف سے معاویہ اور اس کے بعد کی استبدادی حکومتوں کی طرف سے جاری شدہ اس ظالمانہ روش کے خلاف کیا گیا تھا جو حضرت علیؑ اور شیعان علیؑ سے

متعلق تھی اور جسے اس دور کے ظالم و جابر حکمراں تبرا کے نام سے موسوم کرتے تھے اسے روکنے کی طاقت بھی اس وقت کے خلیفہ میں نہیں رہ گئی تھی لیکن اس کے باوجود کسی سُنّی نے رات کی تاریکی میں معزالدولہ کی لکھوائی ہوئی اس عبارت کو کھرچ کھرچ کر مٹا دیا۔ معزالدولہ کو معلوم ہوا تو پھر اس نے اس عبارت کو لکھوانے کا حکم دیا مگر اس کے وزیر مہلبی نے اسے یہ مشورہ دیا کہ صرف معاویہ کا نام باقی رکھا جائے اور اس کے نام کے آگے "والظالمین لآل محمدؐ" یعنی آل محمدؐ پر ظلم کرنے والوں کا فقرہ بڑھا دیا جائے چنانچہ معزالدولہ نے یہ مشورہ قبول کر لیا اور اس کے وزیر نے اس مختصر سی تبدیلی کے ساتھ جامع مسجد کے پھاٹک پر تبرا کی عبارت لکھوا دی۔

معزالدولہ سے شیعوں کو صرف یہی ایک فائدہ پہونچا تھا کہ انھیں مذہبی آزادی مل گئی تھی اور ان پر ظلم و ستم بند ہو گیا تھا مگر اتنی ہی آزادی اس کے دور میں سنیوں کو بھی حاصل تھی یہاں تک کہ جب دونوں فرقے متصادم ہوئے تو حکومت نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔

گزشتہ صدی سے شیعہ فرقہ کو شائستہ تبرا پر اس لیے مجبور ہونا پڑا کہ محمدؐ و آل محمدؐ پر کیچڑ اچھالی جا رہی ہے۔ مشرکوں اور بے دینوں کے اعمال کو عین اسلام قرار دیا جا رہا ہے لہٰذا ضرورت ہے تاریخ کی وہ تصویر دکھانے کی کہ جس سے "خیر و شر" کے خد و خال واضح ہو سکیں تاکہ ہماری جوان نسل اپنے ماضی سے ناآشنا نہ رہے۔

تاریخ کے تدریجی ارتقاء پر اگر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی جائے تو ہر منزل پر "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹتا نظر آتا ہے۔ سقیفہ میں جو کچھ ہوا اگر اتنے ہی پر اکتفا کی جاتی تو عرب کے بوریہ نشیں پیغمبر کی اولاد صبر و شکر کے ساتھ رشد و ہدایت کی فیض رسانی کر کے اپنی نسلیں گزارتی رہتی اور شاید دنیا کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ فرمانروائی کی وراثت کس نے چھینی اور سجادۂ نبوت کی نمائندگی کا اعزاز کس کو ملا۔ لیکن ستم یہ ڈھایا گیا کہ بزدلوں کو بہادر، جھوٹوں کو سچا اور منافقوں

کو کفر اسلام ثابت کرنے کے لیے ظلم کا دروازہ کھول دیا گیا اور جب خلافت مدینے سے دمشق اور بغداد منتقل ہوئی تو صادقین کا قتل عام ایک معمول بن گیا۔

عوام آج کی طرح شروع ہی سے ان پڑھ اور کانوں کے کچے رہے ہیں اور ان کا حافظہ ہمیشہ کمزور پایا گیا ہے۔ یہ راز گنبد اسلام کے پروہتوں کو معلوم تھا لہٰذا روز اوّل سے یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ صرف سامنے کی باتیں عام لوگوں کو بتائی جائیں اور اصل خدوخال کو پوشیدہ رکھا جائے چنانچہ اسی پالیسی پر آج تک عمل ہو رہا ہے اور اپنے محبوب کرداروں کو بدلی ہوئی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ظلم کا ذمہ دار مظلوم کو اور قتل کا سزاوار مقتول کو ٹھہرایا جاتا تھا اور آج بھی یہ سلسلہ برقرار ہے۔ کیا حضرت علیؑ اور ان کی اولادوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک روا رکھنے والے درگزر کے لائق ہیں؟ اور اگر اس کے بعد بھی کوئی علیؑ کے ان دشمنوں کی قصیدہ خوانی کرتا ہے تو کیا اس کو علیؑ کا نام لینے کا حق رہ جاتا ہے؟ یقیناً وہ بھی علیؑ کا دشمن قرار پائے گا اور علیؑ کے دشمن کے لیے حضورؐ کی جو حدیث ہے وہ اس پر صادق آئے گی۔

بہرحال یہ تبرا سننے والے سنتے رہے اور اس کی آواز تاریخ کے ایوانوں میں گونجتی رہی مگر جب شیعوں نے اسی لہجہ میں طبع آزمائی کی تو سب چیخ پڑے اور ہر طرف سے بدعت کے فتاوے صادر ہونے لگے۔

فقہ کی تاریخ کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ شیعہ فقہ اور شیعیان علیؑ روز اوّل سے موجود تھے اور دو سو برس تک تعداد سے قطع نظر مسلمانوں میں صرف دو گروہ پائے جاتے تھے۔ ایک علیؑ کا دوست اور دوسرا علیؑ کا دشمن ـــــ دونوں صورتوں میں محور علیؑ ہی کی ذات تھی ـــــ ظلم وستم کے دھارے میں شیعوں کی تعداد تو نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی لیکن شیرازہ بندی اور

اصول و فروعات فقہ پر کوئی حرف نہیں آیا تھا کیونکہ ہر زمانے میں شیعوں کا امام موجود تھا جس کو ارباب سیاست نے محسوس کیا تو مقابلے کی فقہ اور امام دونوں بنا دئے اور اہلسنت والجماعت کو تشکیل دے کر اسے مقابل لاکر کھڑا کر دیا۔

اس کے بعد کوئی ہمیں جھوٹا کہے تو اسے سوچنا چاہیے کہ آنحضرتؐ سے مامون کے دور تک ہم جو کہتے آئے ہیں کیا اس کے علاوہ اب کچھ اور کہتے ہیں۔ اس کے برعکس دور بنی امیہ میں جہم بن صفوان نے کیا کہا؟ عہد عباسیہ میں واصل بن عطا کے نظریات کیا تھے؟ اور پھر حکومت ساز امام اعظم کے ارشادات کیا تھے؟ لیکن ان سے ہمارے اختلافات اتنے شدید نہ تھے جتنے کہ آگے چل کر الاشعریؒ اور امام احمد بن حنبل کو تفسیخات و ترمیمات سے ہوئے اور وہابی مسلک کے بعد تو شیعہ بھی جھوٹے اور سُنی بھی جھوٹے۔ کیونکہ وہابیت نے دونوں کے نظریات توحید، اعتقاد رسالت اور دوسرے ہر موقف کو باطل قرار دے دیا ہے۔ اگر ان کی فکری اور تاریخی تحقیق کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا تو ایک دن خدا بھی مادیت کے سانچے میں ڈھل جائے گا اور معاویہ و یزید پیغمبری کی سطح کو چھونے لگیں گے۔

تبرّا کی قرآنی حیثیت

(۱) "اذ تبرّأ الّذین اتّبعوا من الّذین اتّبعوا ورأوا العذاب وتقطّعت بھم الاسباب ۝ وقال الّذین اتّبعوا لو انّ لنا کرّۃ فنتبرّأ منھم کما تبرّءوا منّا کذٰلک یریھم اللہ اعمالھم حسرات علیھم وما ھم بخارجین من النّار" (البقرہ۔ ۱۶۶، ۱۶۷)

وہ کیا سخت وقت ہو گا جب پیشوا لوگ اپنے پیروؤں سے تبرا کریں گے اور عذاب کو دیکھیں

گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے اور پھر کہیں گے کہ اگر ہمیں دنیا میں پھر پلٹنا نصیب ہوا تو ہم بھی ان سے اسی طرح تبرا کریں گے جس طرح یہ اس وقت ہم سے تبرا کر رہے ہیں یوں ہی خدا ان کے اعمال کو دکھائے گا جو سرتا پا یاس ہی یاس ہیں اور وہ دوزخ سے نکلنے نہیں پائیں گے"۔

قرآن مجید کی یہ آیت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ وہ لوگ جو دنیا میں حقیقی پیشواؤں کا دامن چھوڑ کر خود ساختہ پیشوا خود بھی بن جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنا مرید بنا کر انھیں گمراہی کے راستے پر ڈال دیتے ہیں' ان کے اور ان کے مریدوں کے درمیان بروز قیامت جم کر تبرے بازی ہوگی جس کو پروردگار عالم اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ان کے اعمال بد کا صلہ یہ ہوگا کہ ان پر تبرا کیا جائے گا اور انھیں اس کا مزہ چکھنا ہوگا۔ پیشوا اپنے پیروں پر تبرا کریں گے اور پیرو کہیں گے کہ کاش ہم دنیا کی طرف پھر پلٹا دئے جائیں تو ہم بھی وہاں ان خود ساختہ پیشواؤں پر اسی طرح تبرا کریں جس طرح وہ ہم پر یہاں کرتے ہیں ـــــ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تبرا اللہ کی نظر میں کوئی ناپسندیدہ فعل نہیں ہے اگر ہوتا تو وہ یہ ہرگز نہ کہتا کہ ایسے لوگوں کے اعمال کا صلہ تبرا کے ذریعہ دیا جائے گا۔

(۲) "قال الذین حق علیھم القول ربنا ھؤلاء الذین اغوینا اغوینٰھم کما غوینا تبرانا الیک" (القصص ۶۳)

"وہ لوگ جو ہمارے عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں بروز قیامت کہیں گے کہ پروردگار! یہی وہ لوگ ہیں جنھیں ہم نے گمراہ کیا۔ اب ہم تیری بارگاہ میں ان لوگوں سے تبرا کرتے ہیں اور ان سے دوری چاہتے ہیں"۔

اس آیت کے ذیل میں بعض سُنی علماء یہ کہتے ہیں کہ اس میں غیر مستحق پیشواؤں اور ان کے پیروں کا تذکرہ ہے' اچھے اور نیک لوگوں سے تبرا کا ذکر نہیں ہے۔ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہو سکتا

کہ شیعہ بھی تو غیر مستحق پیشواؤں سے تبرا کرتے ہیں اور جو مستحق پیشوا ہیں ان سے تولیٰ شیعوں کے نزدیک جزو ایمان ہے۔

(۳) "وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الا عن موعدۃ وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرا منہ ان ابراھیم لاواہ حلیم" (توبہ۔ ۱۱۴)

"حضرت ابراہیم کا اپنے چچا (آذر) کی مغفرت کے لیے دعا کرنا اس وعدہ کے تحت تھا کہ جو انھوں نے اس سے کیا تھا لیکن جب انھیں معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو انھوں نے اس سے تبرا کیا اور علیحدگی اختیار کی"۔

اس آیۂ کریمہ سے بھی واضح ہے کہ حضرت ابراہیم جیسے جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبرؑ نے بھی بُرے اور ناپسندیدہ لوگوں سے تبرا کیا ہے لہذا سیرت پیغمبری کے تحت شیعہ حضرات بھی بُرے اور ناپسندیدہ لوگوں سے تبرا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی معترض کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ شیعوں کے اس فعل پر اعتراض کرے یا انھیں اس مستحسن فعل سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔

مذکورہ آیات سے یہ امر بخوبی واضح ہے کہ تبرا کوئی گالی نہیں ہے۔ اگر پروردگار عالم کی نظر میں تبرا کی حیثیت گالی کی ہوتی تو وہ اس کا ذکر ہرگز قرآن مجید میں نہ کرتا اور نہ ہی پیغمبر اسلام یہ ارشاد فرماتے کہ "اللھم انی ابرأ من صنع خالد بن ولید" یعنی پالنے والے میں خالد بن ولید کی کارگزاریوں سے تبرا کرتا ہوں"۔ پیغمبر اکرم کی یہ حدیث بخاری میں موجود ہے۔

جوازِ لعنت قرآن و حدیث کی روشنی میں

لعنت کا لفظ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے مثلاً "لعنت اللہ علی الکاذبین" اور "لعنۃ اللہ علی الظالمین" یعنی جھوٹوں پر لعنت اور ظالموں پر لعنت وغیرہ — لیکن یہاں پر ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے خود تو لعنت کی ہے مگر اس نے دوسروں کو لعنت کرنے کا حکم کہاں دیا ہے۔ اس اشتباہ کو قرآن حکیم نے ایک دوسرے مقام پر ان الفاظ کے ساتھ دور کیا ہے:۔

"اولٰئک جزاؤھم ان علیھم لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین" (آل عمران ۸۰)

(ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر خدا، فرشتوں اور دنیا جہان کے تمام لوگوں کی لعنت ہے)

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

"ان الذین کفروا وماتوا وھم کفار اولٰئک علیھم لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین" (بقرہ ۱۶۱)

(جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے۔ ان پر خدا کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے)

ان دونوں آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اگر فرشتوں اور ان تمام لوگوں کو جن کا شمار مخلوق خدا میں ہے لعنت بھیجنے کا حکم نہ ہوتا تو قرآن تذکرہ ہی نہ کرتا بلکہ یہ کہا جاتا کہ آخر ان فرشتوں اور دیگر

لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بھی لعنت بھیجنے لگے ہیں۔ اس انداز سے ذکر نہ کرنا اس بات کی محکم دلیل ہے کہ نگاہ قدرت میں یہ عمل ممدوح ہے نیز اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لعنت کا استحقاق غیر خدا کو بھی حاصل ہے جس میں فرشتے اور انسان نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ شاید اسی لیے پیغمبر اسلام نے خود بھی مستحقین پر لعنت کی ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں مرقوم ہے "قال النبیؐ اللھم العن شیبہ بن ربیعہ وعتبہ بن ربیعہ وامیہ بن خلف[1] یعنی رسول اللہ نے فرمایا کہ خدا لعنت کرے شیبہ بن ربیعہ پر عتبہ بن ربیعہ پر اور امیہ بن خلف پر

اب اگر کوئی یہ کہے کہ آنحضرتؐ نے تو صرف کفار پر لعنت کی ہے مسلمانوں پر نہیں کی تو ناسخ کافیہ میں اس شبہ کو بھی دور کر دیا گیا ہے اور بتا دیا گیا ہے کہ خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر اگر لعنت کا حقدار ہے تو اس پر لعنت ضرور کی جائے گی۔ عبارت ان الفاظ کے ساتھ ہے۔ "قد لعن النبی اشخاصا ستماھم وماتوا علی الاسلام کابی سفیان بن حرب وسہیل بن عمرو وعمرو بن عاص وابن مروان وغیرہم ولعن عمر بن الخطاب خالد بن ولید حین قتل مالک بن نویرہ"[2] یعنی آنحضرتؐ نے چند اشخاص پر لعنت کی ہے درآنحالیکہ وہ مسلمان مرے جیسے کہ ابوسفیان بن حرب سہیل بن عمرو، عمرو بن عاص اور ابن مروان وغیرہ اور عمر بن خطاب نے لعنت کی ہے خالد بن ولید پر جب اس نے مالک بن نویرہ کو قتل کیا۔

پیغمبر اسلام نے مروان کے باپ حکم پر لعنت کا حربہ استعمال کیا ہے جبکہ مروان اس کے صلب میں تھا جیسا کہ صاحب تاریخ الخلفاء نے لکھا ہے کہ "قالت عائشہ ولکن رسول اللہ ابا مروان ومروان فی صلبیہ فمروان فیض من لعنت اللہ"[3] یعنی عائشہ فرماتی ہیں کہ

---

[1] بخاری کتاب الحج ص ۲۶۰ مطبوعہ مصر [2] ناسخ کافیہ ج ۱ ص ۱۱ المبلی [3] تاریخ الخلفاء ص ۱۴۲ تتمہ حالات معاویہ مطبع مجیدی کانپور

اس وجہ سے لبیک کہنے سے منع کرتے تھے کہ اس دن حضرت علیؑ لبیک لبیک کہا کرتے تھے[1] اور علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ معاویہ نے سمرہ کو جب بصرہ کی گورنری سے معزول کیا تو سمرہ نے کہا خدا لعنت کرے معاویہ پر' اگر میں نے خدا کی اتنی اطاعت کی ہوتی تو وہ مجھ پر یہ عذاب نازل نہ کرتا[2]

مروج الذہب میں ہے کہ محمد بن ابو بکر نے معاویہ کو ایک خط لکھا اور اس میں تحریر کیا کہ "انت لعین ابن لعین" یعنی تو بھی ملعون ہے اور تیرا باپ بھی ملعون تھا[3]

ملا علی قاری کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ نے "لعن اللہ عمرو بن عبید" کہہ کر عمرو بن عبید پر لعنت کی ہے[4]

قرآن' حدیث اور تاریخ کے ان تمام مذکورہ حوالوں سے لعنت کا جواز نہ صرف اجتماعی و انفرادی حیثیت سے بلکہ نام بنام ثابت ہے۔ نہ اس میں انکار کی کوئی گنجائش ہے اور نہ کسی قسم کی تاویل کی۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی قرآنی آیات ایسی ہیں جو لعنت کے جواز پر دلالت کرتی ہیں مثلاً

۱۔ فمن حاجک فیہ من بعد ما جائک من العلم فقل تعالوا ندع ابناءنا و ابنائکم و نساءنا و نسائکم و انفسنا و انفسکم ثم نبتھل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین.... (آل عمران آیت ۶۱)

(تمھارے پاس آنے کے بعد کوئی شخص اگر تم سے حجت کرے تو تم ان سے کہہ دو کہ ہم اپنے بیٹوں کو لائیں تم اپنے بیٹوں کو لاؤ' ہم اپنی عورتوں کو لائیں تم اپنی عورتوں کو لاؤ' ہم اپنے نفسوں

[1] کنز العمال ج ۳ ص ۳۰ [2] تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۹۵ [3] مروج الذہب ج ۶ ص ۶۹
[4] شرح فقہ اکبر ص ۴۳

کو لائیں تم اپنے نفسوں کو لاؤ پھر ہم سب مل کر گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر لعنت کریں.....)

اس آیۂ کریمہ کے ذریعہ پروردگار عالم اپنے محبوب ترین رسولؐ کو حکم دے رہا ہے کہ اے رسولؐ! توم نصاریٰ سے کہہ دو کہ ہم بھی جھوٹوں پر لعنت کریں اور تم بھی کرو۔ اس طرح خداوند عالم نے اپنے رسولؐ کو بھی لعنت کرنے کا حکم دیا ہے اور عیسائیوں کو بھی اس فعل کی دعوت دی ہے۔

۲۔ "ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدیٰ من بعد ما بیناہ للناس فی الکتاب اولئک یلعنھم اللہ و یلعنھم اللاعنون"

"جو لوگ ہماری روشن دلیلوں اور ہدایتوں کو چھپاتے ہیں جبکہ ہم نے کتاب میں صاف صاف بیان کر دیا ہے تو ان پر خدا بھی لعنت کرتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں۔"

(پ ۲ رکوع ۳)

۳۔ "ومن یقتل مومنا متعمدا فجزائہ جھنم خالدا فیھا و غضب اللہ علیہ و لعنہ و اعد لہ عذابا عظیما (پ ۵ رکوع ۱۰)

(جو شخص جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر غضب الٰہی ہوگا اور اللہ کی لعنت اس پر نازل ہوتی رہے گی اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

۴۔ فھل عسیتم ان تولیتم ان تفسدوا فی الارض و تقطعوا ارحامکم اولئک الذین لعنھم اللہ فاصمھم و اعمیٰ ابصارھم

(احقاف آیت ۷)

تم لوگوں سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم زمین پر فساد پھیلانے لگو اور اپنے رشتوں کو توڑنے لگو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور گویا خود اس نے ان

کے کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔"

(۵) "اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا" (پ ۲۲ ع ۴)

"جو لوگ اللہ اور رسولؐ کو عذاب پہنچاتے ہیں یا پہنچائیں گے خدا ان لوگوں پر یقیناً دنیا و آخرت میں لعنت کرتا رہے گا اور اس نے ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

مولانا شاہ محمد قاسم چشتی نظامی سجادہ نشین درگاہ پور پٹنہ اپنے ایک مقالہ "کفر یزید" مطبوعہ محرم ۱۳۸۳ھ میں متعدد آیات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس آیت ان الذین یؤذون اللہ ... الخ کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ۔

"اس میں تو اور بھی قیامت ہے۔ "عذاب مہین" کے ساتھ دنیا اور آخرت دونوں جگہ لعنت ہے۔ جب رسول کے آگے چلنے اور رسولؐ کی آواز پر آواز بلند کرنے سے اللہ کا غیظ و غضب اس حد تک پہونچ جاتا ہے کہ اصحاب جیسی گراں مایہ ہستیوں کے لیے حبط عمل کی سزا مقرر ہو جاتی ہے تو کربلا کے واقعہ کا کیا پوچھنا، صرف یزید ہی نہیں بلکہ وہ سارے کے سارے لوگ جو اس شیطنت میں شریک تھے مستحق لعنت تھے۔ ان لوگوں پر جب دین و دنیا دونوں جگہ خدا کی لعنت ہے تو فرشتوں، جناتوں اور انسانوں کو ان پر لعنت بھیجنے سے کون روک سکتا ہے۔"

مشہور سُنی عالم علامہ تفتہ زانی شرح مقاصد میں لکھتے ہیں۔

"اگر کوئی یہ کہے کہ بروں پر لعنت جائز نہیں ہے تو اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ علمائے اہلسنت چونکہ صحابہ سے حسنِ ظن رکھتے ہیں اور ان کے لیے تاویلیں کرتے ہیں لہٰذا اس ڈر کی وجہ سے لعنت سے لوگوں کو روکتے ہیں کہ یہی لعنت بڑھتے بڑھتے صحابہ کبار تک پہونچ جاتی ہے جیسا کہ رافضیوں کا شعار ہے ورنہ کون ہے جس پر اس کا جواز کھل نہیں گیا کہ ظالموں پر لعنت

کی جانی چاہیے۔ شیعہ اپنی دعاؤں میں بھی لعنت کرتے ہیں اور اپنی مجلسوں میں بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اہلبیت پر جو ظلم ہوا مجال نہیں کہ اس کو کوئی چھپا سکے یا جو برائیاں ظالموں کے ساتھ چلی گئیں ان کی کوئی پردہ پوشی کر سکے۔ وہ اتنی ظاہر بظاہر اور اتنی بڑی ہیں کہ ممکن ہے پہاڑ بھی ان کی گواہی دے اور گونگے بھی بول اٹھیں..... یاد رکھو آخرت کا عذاب بہت شدید اور باقی رہنے والا ہے۔"

اس موقع پر ہم بنی امیہ کے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا ایک قول بھی نقل کر دینا چاہتے ہیں۔ حضرت ابوبکر و عمر نے پیغمبر اکرم کی بیٹی جناب فاطمہ زہراؑ کو ان کے باپ کے ترکہ سے محروم کر دیا تھا اور فدک کی جاگیر بھی ان کے قبضہ سے چھین لی تھی جو بیٹی کے حق میں پیغمبرؐ کی طرف سے ہبہ کردہ تھی۔ اس سلسلے میں حضرت فاطمہ زہراؑ کے دعوے کو بھی ان کی گواہیاں قبول نہ کرتے ہوئے شیخین نے اپنی ہٹ دھرمی کی بنا پر رد کر دیا تھا پھر اس جاگیر کو حضرت عثمان نے اپنے حجام کو حجامت بنوانے کے صلے میں دے دیا تھا۔ رفتہ رفتہ جب عمر ابن عبدالعزیز کا دور آیا تو انھوں نے فدک کا علاقہ اولاد فاطمہؑ میں سے پانچویں امام محمد باقر علیہ السلام کو واپس کر دیا، اس پر امرائے حکومت نے اعتراض کیا کہ "طعنت علی الشیخین" یعنی تم نے شیخین پر طعن کی تو عمر ابن عبدالعزیز نے کہا "هما طعنا علیٰ انفسنا" یعنی شیخین نے فاطمہ سے فدک چھین کر طعن کا دروازہ تو اپنے نفسوں پر خود کھولا ہے پھر اس نے کہا فدک پر فاطمہ کا قبضہ تھا حکومت نے ان کو قبضے سے بے دخل کرنا چاہا تو وہ شیخین کے دربار میں گئیں اور حضرت علیؑ، اُم ایمن، حسنؑ اور حسینؑ کی گواہیاں پیش کرنے دعویٰ کیا کہ یہ جائداد میری ہے۔ رسولؐ کی بیٹی سے یہ امر بعید تھا کہ وہ جھوٹا دعویٰ کرتیں۔ میرے نزدیک تو ان کا دعویٰ ہی کافی تھا کسی گواہی یا شہادت کی ضرورت ہی نہیں تھی لہٰذا فدک واپس کر کے میں نے انصاف

کا حق ادا کیا ہے اور اس امر کا امیدوار ہوں کہ بروز قیامت جناب فاطمہ زہرا اور حسنؑ و حسینؑ میری شفاعت کریں گے۔"

اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس حق گوئی کے جرم میں دشمنانِ آلِ محمدؑ نے عمر ابن عبد العزیز کو زہر دے کر ختم کر دیا تھا۔

رفض کیا ہے؟

بعض جہلا رفض کے معنوں میں "کسی کو گالیاں دینا" مراد لیتے ہیں جو غلط ہے درحقیقت رفض کے معنی لغوی اعتبار سے علاحدگی اور دوری اختیار کرنے کے ہیں اور شیعہ چونکہ محمدؐ و آلِ محمدؑ سے محبت رکھتے ہیں ان کی اطاعت و پیروی کرتے ہیں اور ان کے دشمنوں سے علیحدگی اور دوری اختیار کرتے ہیں اس لیے دورِ معاویہ سے انھیں رافضی کہا جاتا ہے یا اسے یوں سمجھ لیجیے کہ شیعوں کا رفض یہ ہے کہ وہ رسولؐ اور آلِ رسولؑ پر درود بھیجتے ہیں اور ظالموں و غاصبوں پر لعنت کرنے کے مثبت اور منفی دونوں امور میں اللہ، رسولؐ اور فرشتوں کے ہم زبان ہیں یعنی شیعہ جن لوگوں کو ظالم، غاصب اور محمدؐ و آلِ محمدؑ کا دشمن سمجھتے ہیں، ان سے تبرا کرتے ہیں اور ان پر اسی طرح لعنت کرتے ہیں جس طرح خدا، اس کے رسولؐ اور فرشتوں نے لعنت کی ہے۔

اور اگر حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام سے محبت یا ان کی مدح کرنے کا نام رفض ہے جن کی مدح میں بقول علامہ جلال الدین سیوطی تین سو آیتیں نازل ہوئی ہیں اور بقول نظام الدین اولیا، پورا قرآن علیؑ کی مدح میں ہے تو پھر کسی بزرگ کا یہ منظوم قول بھی ذہن میں رکھنا چاہیے ؎

نام حیدر من بخوانم خلق گوید رافضی — پس خدا و مصطفیٰؐ جبرئیل باشد رافضی

ملا نور الدین جامی سلسلۃ الذہب میں فرماتے ہیں کہ:-

رفض گر ہست حبِ آلِ نبیؐ — رفض فرض است بر فقیر و غنی

اور امام شافعی کا اعلان ہے کہ:-

"اگر آلِ محمدؑ کی محبت گناہ ہے تو یہ ایک ایسا گناہ ہے کہ جس سے میں کبھی توبہ نہیں کر سکتا اور اگر آلِ محمدؑ کی محبت کا نام ہی رفض ہے تو تمام دنیا کے لوگوں میں سب سے بڑا رافضی میں ہوں"۔

تبرّا اور لعنت پر عقلی دلیل

عقلی اور منطقی اصولوں کی روشنی میں تبرا و لعنت کے معترضین کی یہ بات درست نہیں ہے کہ شیعہ حضرات کسی فرقہ کے بزرگوں کو اس لیے برا کہتے ہیں یا ان پر لعنت ملامت کرتے ہیں یا ان سے تبرا کرتے ہیں کہ وہ انھیں نہیں مانتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ صرف انھیں لوگوں کو برا کہتے ہیں جو واقعی برے تھے یا برے ہیں۔

اس ذیل میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی ایسے شخص پر لعنت کرنا، اس سے تبرا کرنا یا اسے برا کہنا جو واقعاً برا ہے درست ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کسی شخص کو برا کہنے اور برا سمجھنے میں کیا فرق ہے؟

اہلِ علم حضرات اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ "برے اور بھلے" کے درمیان امتیاز پیدا کرنا حواسِ باطنی کا کام ہے لہٰذا برے کو برا اور بھلے کو بھلا سمجھنے پر انسان فطرتاً مجبور ہے

یعنی بھلے اور بُرے میں تمیز کرنا انسان کا فطری فعل ہے۔

اور اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ہم بُرے کو بُرا نہیں سمجھتے تو اس نہ سمجھنے والے شخص کے بارے میں اس کے علاوہ اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ نفس ناطقہ سے محروم اور مجنون ہے نیز اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابل غور ہے کہ بُرا نہ سمجھنے والا شخص اخلاقی اعتبار سے کس حد تک گنہگار اور قابل الزام ہے۔

اوّل تو بُرے کو بُرا نہ کہنے والا خود جہالت میں گرفتار ہو جاتا ہے یعنی جب اس کو معلوم ہوا کہ کوئی شخص بُرا ہے تو اس نے اس کو بُرا سمجھ لیا کیونکہ اس کے نزدیک معلوم کرنے اور سمجھ لینے میں کوئی فرق نہیں ہے دوسرے یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جو شخص کسی بُرے آدمی کو بُرا نہیں سمجھتا 'بذات خود بُرا ہے یا اچھا؟

اس منزل میں عقل کا فیصلہ ہوگا کہ اوّل تو بُرے کو بُرا نہ سمجھنے والا شخص بُرا نہ سمجھنے کا اقرار محض زبانی کر رہا ہے ورنہ اس کا دل اس برے شخص کو بُرا ضرور سمجھتا ہوگا۔ دوسرے اگر واقعی اس کا دل بھی اس بُرے شخص کو بُرا نہیں سمجھتا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے بھی برے کاموں کو انجام دیتے دیتے اپنے اندر وہ فطرت ثانیہ پیدا کر لی ہے جو کسی برے فعل کو بُرا سمجھنے ہی نہیں دیتی یعنی بُرے کو بُرا نہ سمجھنے والا شخص خود بھی بُرا ہے۔

اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ایک غریب و نادار اور مجبور شخص بھوک کی مصیبت میں گرفتار ہو کر کسی سڑک کے کنارے پڑا ہے اور وہ قریب المرگ ہے۔ اتفاقاً ادھر سے ایک دردمند اور رحمدل شخص گزرا اور اس نے اس غریب کی حالت پر ترس کھا کر اسے کچھ روپے دے دئے تاکہ وہ اپنے کھانے پینے کا انتظام کرے۔ جب وہ رحمدل شخص روپے دے کر چلا گیا تو فوراً ایک لٹیرا اور شقی القلب شخص وہاں پہنچا اور اس نے اس مصیبت زدہ شخص کو مار پیٹ کر یا ڈرا دھمکا کر

وہ روپے اس سے چھین لئے۔ اسی وقت ایک تیسرا شخص بھی وہاں پہنچ گیا اور اس نے اس لٹیرے کے اس طرز عمل کو بھی دیکھا اور مصیبت زدہ شخص کی فریاد کو بھی سنا۔ اب اہل انصاف خود فیصلہ کریں کہ فطرتاً کیا یہ ممکن ہے کہ تیسرا شخص اس پہلے رحمدل و روپے مرحمت کرنے والے شخص کو قابل مدح و ستائش اور اس لٹیرے کو قابل نفرت و مذمت نہ سمجھے؟

اس فطری اصول کی روشنی میں یہ معلوم ہوا کہ "اچھے کو اچھا" اور "بُرے کو بُرا" سمجھنا یا نہ سمجھنا انسان کا اختیاری فعل نہیں ہے اور نہ ہی یہ امر کسی انسان کی ذاتی خوشی یا ناراضگی پر موقوف ہے بلکہ فطرتی تقاضوں کے تحت انسان برے کو برا اور اچھے کو اچھا سمجھنے کے لیے مجبور ہے اور اسی مجبوری کے تحت اگر وہ تیسرا شخص اپنے نفس کی اصلاح کے لیے اس لٹیرے اور ظالم شخص کے افعال سے نفرت کرنے لگے اس کو بُرا کہنے لگے۔ اس کی ذات و کردار سے پناہ چاہے اس سے دوری اختیار کرے' اظہار بیزاری کرے یا اس سے تبرّا کرے یا اس پر لعنت کرے تو اس میں غلط کیا ہے؟

اس موقع پر بُرے کو بُرا کہنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے۔ اس لیے کہ تحقیق کے بعد بُرا کہنے والے شخص کی ہمنوائی اور پیروی میں دوسرے لوگ بھی اس لٹیرے کو بُرا کہیں گے اس سے نفرت و بیزاری کا اظہار کریں گے' اس کے شر سے محفوظ رہنے کی کوشش کریں گے اور خود برائیوں سے پرہیز کریں گے۔ اب ایسی صورت میں بُرا کہنے والا اور حق بات کا اظہار کرنے والا شخص قابل ستائش ہے یا قابل اعتراض؟ یقیناً ہر انصاف پسند انسان یہی فیصلہ کرے گا کہ اس لٹیرے کو بُرا کہنا محض اخلاقی فرض ہی نہیں بلکہ ایک طرح کی مذہبی عبادت بھی ہے اور ایسے مواقع پر بُرے شخص کو بُرا نہ کہنا یا اس کے طرز عمل کو دیکھ کر خاموشی اختیار کرنا بجائے خود ایک ظلم عظیم اور گناہ کبیرہ ہے۔ اسی آخری دلیل کے تحت نہ صرف شیعہ بلکہ دنیا کے تمام حق پسند افراد برے شخص کو بُرا کہنا ضروری سمجھتے ہیں اور اسی کا نام تبرّا ہے۔

احقرالعباد فروغ کاظمی

کتابیات

۱۔ قرآن مجید
۲۔ صحیح بخاری
۳۔ صحیح مسلم
۴۔ صحیح ترمذی
۵۔ مشکوٰۃ شریف
۶۔ مستدرک حاکم
۷۔ مسند احمد
۸۔ مروج الذھب
۹۔ تاریخ بغداد
۱۰۔ تفسیر کبیر
۱۱۔ تاریخ طبری
۱۲۔ تاریخ الخلفاء
۱۳۔ تفسیر در منشور
۱۴۔ تطہیر الجنان
۱۵۔ تاریخ کامل
۱۶۔ عیون اخبار الرضا
۱۷۔ عقد الفرید
۱۸۔ فتح الباری
۱۹۔ اصول کافی
۲۰۔ البدایہ
۲۱۔ شعب الایمان
۲۲۔ نصائح کافیہ
۲۳۔ خلافت وملوکیت
۲۴۔ روضۃ الاحباب
۲۵۔ ربیع الابرار
۲۶۔ شرح فقہ اکبر

نواب جعفر میر عبداللہ

ضمیر نقوی (جرنلسٹ)

شعر و سخن کی دُنیا سے انشا پردازی کی منزل تک محقق عصر جناب فروغ کاظمی میرے اُستاد ہیں اور مجھ میں یہ جسارت نہیں کہ میں استادِ محترم کی کسی تالیف و تصنیف پر اپنی قلمی رائے ظاہر کرسکوں بس اتنا ہی کافی ہے کہ "حقیقت تبرا" کے عنوان سے یہ کتاب ایک ایسی جامع کتاب ہے جس کی قوم کو سخت ضرورت بھی تھی اور جو حالاتِ حاضرہ کے اہم تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے۔" اسے پڑھئے سمجھئے اور دوسروں کو بھی سمجھائیے:

مجھے فخر ہے کہ میں اپنے محسن و کرم فرما جناب نواب جعفر صاحب میر عبداللہ کے اس مالی تعاون سے جو موصوف نے میری ایک ذاتی کتاب کے سلسلے میں فرمایا تھا، اس انمول خزانے کی طباعت کا شرفِ حاصل کرتے ہوئے دعا کرتا ہوں کہ معصومینؑ ہم دونوں کے اس امرِ خیر کو قبول فرمائیں۔

ضمیر نقوی (جرنلسٹ)